The Faculty Journal of Arts, Rajshahi University
Volume 40, December 2025, ISSN 1813-0402

دکن کے چند اردو شعراء: ایک مختصر جائزہ

[Some Urdu Poets in the Deccan : A brief Review]

Dr. Md. Roshidul Alam
Professor, Department of Urdu, University of Rajshahi, Rajshahi-6205, Bangladesh

ARTICLE INFORMATION

The Faculty Journal of Arts
Rajshahi University
Volume 40, December 2025
ISSN: 1813-0402 (Print)

DOI: https://doi.org/10.64487/FJARU.V40A28

Received : 30 June 2025
Received in revised: 31 March 2026
Accepted: 17 February 2026
Published: 15 April 2026

Keywords: Urdu literature, Urdu poets, Narrative, Impact.

ABSTRACT

Urdu poetry in the Deccan region is known as Dakani or Deccani, and it has a rich history and distinct style. It's considered the earliest form of Urdu literature, flourishing before its development in Delhi and Lucknow. Several notable Urdu poets emerged from the Deccan region. Key figures include Muhammad Quli Qutb Shah, a royal poet and founder of Hyderabad, and figures like Wajhi and Gavvasi who contributed to the early development of Deccani Urdu. Later, Wali Mohammed Wali, sometimes called the "Chaucer of Urdu poetry," further developed the language and its poetic forms. Other important poets from the Adil Shahi dynasty of Bijapur include Ibrahim Adil Shah II, Rustami, Nusrati, and Mirza.

جب ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ ایک ہی جگہ طویل عرصے تک سکونت اختیار کرے اور آپس میں باہم تعلقات اور معاشرات بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں ہے تو یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ان قوموں میں ایک نئی زبان پیدا ہو جاتی ہے۔ دکنی اردو کی حالت بھی اس قاعدہ سے مختلف نہ تھی۔ چنانچہ اردو ادب کی تاریخ میں دکنی اردو کی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ جس زمانے میں دکنی اردو ادب کے مختلف قدیم نمونے ملتے ہیں، اسی زمانے میں اردو کی جائے پیدائش تقریبا شمالی ہند اردو ادب سے خالی تھی۔ دکن میں اردو کی ترویج میں ایک بڑا ہاتھ صوفیائے کرام کا ہے جنہوں نے ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ کی۔ یہی وجہ ہے کہ دکن میں جو بنیادی فن پارے قدیم اردو میں وجود پذیر ہوتے ان میں زیادہ تر کی نوعیت دینی و مذہبی ہے۔ شیخ عین الدین گنج عالم جو تغلق کے دور میں دکن وارد ہوئے تھے انہوں نے دکنی زبان میں چند مختصر کتابیں تحریر کیں۔ یہ ابتدائی رسائل دکنی زبان یا قدیم اردو کا بنیادی اثاثے قرار دیے جاتے ہیں۔

اگرچہ اردو زبان دہلی کی پیداوار ہے مگر اردو ادب کا فروغ اشاعت اور ارتقاء دکھن بھارت میں سب سے پہلے ہوا تھا۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جب محمد تغلق نے ۱۳۲۹ء میں دکن بھارت کو فتح کیا تو حکمرانی کی آسانی کی غرض سے انھوں نے دہلی کے بجائے دکھن بھارت کے دیوگیر کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا اور تمام سرکاری ملازموں کو دکن چلے آنے کا حکم دیا۔ چونکہ شاہی حکم تھا، اس لئے سرکاری ملازموں کے ساتھ ساتھ عام لوگ بھی دکن جا کر بس گئے تھے۔ اس وقت اگرچہ سرکاری زبان فارسی تھی مگر عام لوگوں کی مادری زبان اردو تھی۔ اس لئے دہلی کے یہ لوگ اردو بولتے ہوئے دکن آئے تھے اور دکن کے مقامی باشندوں سے لگاؤ پیدا ہو گیا۔ یہ بات یاد رکھنے کی قابل ہے کہ اس سے پہلے دکھن بھارت میں اردو کا کوئی نام و نشان نہ تھا اور یہاں ڈراوڈی خاندان کی کئی زبانیں (جیسے تلینگو، کنڑی، تامل وغیرہ) رائج تھیں، جو اردو سے بالکل الگ تھی۔ ان زبانوں سے دہلی کی اردو زبان مخلوط ہو کر ایک نئی زبان پیدا ہو گئی جس کو ہم "دکنی اردو" کے نام سے پکارتے ہیں۔ اسی طرح دکھن بھارت میں اردو کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

بزرگانِ دین نے اسی دکنی اردو میں رشد وہدایت کا کام کیااوراس طرح اس زبان کو مقبولیت حاصل ہونی شروع ہوئی اور پھر تو اس کی رفتار ترقی دکن میں اتنی تیز ہوگئی کہ جب دکن میں مستقل تصانیف اور تحریری نمونے ملتے ہیں اس وقت شمالی ہند میں کوئی ادبی کارنامہ نظر نہیں آتا۔ جن شعرائے دکن نے اردو شاعری کو ترقی دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان میں شاہ میراں جی شمس العشاق، شاہ برہان الدین جانؔم، اشرؔف، شوقؔی، محمد قلی قطب شاہ، وجہؔی، عبداللہ قطب شاہ، ولؔی، فیروؔز، عبدؔل، نصرؔتی، باجؔن، محمد اکبر حسینی وغیرہ کے نام ہی اہمیت کے حامل ہیں۔[1] آئیں دکن میں اردو کے ارتقا کے حوالے سے چند اہم شعراء پر نظر ڈالتے ہیں۔

شاہ میراں جی شمس العشاق

شاہ میراں جی شمس العشاق دکنی کے ایک بہت بڑے صوفی بزرگ مصنّف ہیں جو سنہ ۱۴۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنے بزرگوں کی طرح اردو ہی میں تعلیم و تیقن کے علاوہ تصنیف و تالیف کا بھی کام کیا۔ انھوں نے بیجاپور کے رہنے والے تھے اور وہیں وفات پائی۔ ان کے مکان اور خانقاہیں اردو کا مرکز بن گئی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے عوام اور مریدوں کی تیقن کے لئے اردو میں بہت کچھ لکھا اور ان کی اردو کتابوں کے نمونے اب تک موجود ہیں جن کا ذکر ان کا شمار بہمنی دور کے اولیائے کرام میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی خلق خدا کی ہدایت کے لیے وقت کیے رکھی۔ ان کی منظر عام پر آنے والی تصانیف میں خوش نامہ اور بشارت الذکر قابل ذکر ہیں۔ ان کے نظم میں کئی رسالے تصنیف کیے تھے۔ چند یہ ہیں۔[2]

۱۔ خوش نامہ: یہ ایک مثنوی ہے۔ جس میں ایک نوجوان لڑکی خوش یا خوشنودی کا قصہ لکھا جو شاہ پور میں صرف سترہ سال کی عمر میں انتقال کر گئی۔ وہ بھولی بھالی اور سب کی پیاری تھی۔ دوسری لڑکیوں کی طرح شوخ و شنگ نہ تھی اور بناؤ سنگھار کی جگہ خدا کی لگن لگی ہوئی تھی۔ نمونہ یہ ہے۔

توں رحمان رحیما میرا مہر محبّت بھریا
میں تو باندی بروا تیری تیں مجھ ہاتھوں دھریا
ناں میں کیتی بندگی تیری نادھر کیتی یاد
دائم کیتی آگل تیرے سلکوں تھے فریاد
تیں ہی میرا لاڑ چلایا کبھوں نہ ہوا اداس
آپ سندیسا توڑ گیا تیں تیری منجھکوں آس[3]

۲۔ خوش نغز: شعر کی چھوٹی سی مثنوی ہے۔ اس مثنوی میں بھی اسی دوشیزہ کا ذکر ہے۔ اس میں وہ شاہ صاحب سے مختلف عنوانوں مثلاً عرفان وروح، عقل و عشق اور مراقبہ وغیرہ کے بارے میں سوالات کرتی ہے اور یہ ہر ایک کا جواب ایک نئے بات میں دیتے ہیں۔ اس طرح کل نو بات ہیں۔ نمونہ ہے۔

خوش پوچھے کی کہو میراں جی عام اچھے کیتے
پیر کہیں سن جیتے تن اچھیں عام تیتے
خوش کہی مجھ کہی میراں جی عشق بڑایابودہ
پیر کہیں میں آکھوں بیان دھرنااس میں سودہ ۴

۳۔شہادت الحقیقت: میراں جی کی سب سے اہم اور طویل نظم ہے۔اس میں تصوف و معرفت کے مسا متعلق ایک طویل نظم ہے جس کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ان کے کلام میں بلندی اور ادبیت کم ہے۔ان کی تصانیف کا موضوع تصوف تھا۔نمونہ ہے۔

یہ سب عالم تیرا　　رزاق سبھوں کیرا
تجھ بن اور نہ کوے　　ناخالق دوجا ہوئے
جے تیرا ہو کرم　　توٹوٹے سبھی بھرم
اس کارن تجھ کو دھاؤں　　اور تیرا نام لیاؤں
ہے تیرا انت نہ پار　　کس موکھوں کروں اچار ۵

میراں جی نے نثر میں بھی بہت کچھ لکھا ہے۔شرح مرغوب القلوب ان کا لکھا ہوا ایک رسالہ نثر میں ہے۔جس میں دس باب ہیں۔ہر باب کسی آیت قرآنی یا حدیث سے شروع کرتے ہیں اور پھر اس کا ترجمہ اور مختصر شرح کرتے ہیں۔اس کا نمونہ یہ ہے:

"پیغمبر کہے خدا کی آشنائی جے کوئی بوجھتا ہے انو کیاں توں رہ کر انو تھے بوجھ انو تھے تون سن ہور چپ نکوا چہ۔اس چار پاتاں کا پند ہے۔یوں شریعت میں پہلے پاوں رکھ کہ طریقت شریعت مینچ ہے۔

پیغمبر کہے جو کچھ کام کرے گا کوئی خدا کا نانوں نالے کر تو اد کام پائمال ہو گا۔سرانا نواز ناخدا کوں بہت کہ اوپالنہار ہے عام کا۔"۶

شاہ برہان الدین جانم

اسی زمانے میں بیجاپور میں ایک بہت بڑے ادیب اور شاعر شاہ برہان الدین جانم (سنہ ۱۵۴۳۔۱۵۹۱ء) موجود تھے جو شاہ میراں جی کے فرزند اور خلیفہ تھے۔صوفی اور عالم تھے۔ان کی کئی کتابیں اس وقت موجود ہیں۔ان کا کلام بہت مقبول ہوا اور اب بھی ہندوستان میں دور دور اس کے نسخے ملتے ہیں۔ان کی شعری تصانیف بھی بہت ہیں۔ان کی مشہور کتابیں یہ ہیں:

ا۔ارشاد نامہ: ڈھائی ہزار ابیات کی طویل مثنوی ہے جو شایع ہو چکی ہے۔اس میں طریقت کی وضاحت کی ہے اور نظم مکالمہ کی صورت میں ہے۔اس میں حمد و نعت کے بعد اپنے پیر و مرشد اور والد شاہ میراں جی کی مدح لکھی ہے اور پھر تصوف کے مضامین منظوم کئے ہیں۔شاہ میراں جی کی مدح لکھتے ہیں:۔

صفت کروں کچھ اپنا پیر جس تھے روشن ہوئے ضمیر
دھوں جگ میں منجھ میّت وہی سمروں لے من نیت وہی
تس کوں سمریں تن من شاد جس کااہے منجھ پر ساد
جگ میں اہے توں ہی رتن ہردے میں لے کروں جتن
راکھیاکودن کواس ٹھاوں تل تل سمروں لےاس نادل
پیر میراں جی شمس عشاق دھوں جگ رب تجھ کیا کشاف ۷

۲۔ سُکھ سہیلا: سُکھ سہیلاایک ترکیب بند ہے جس کا ہر بند چار مصرعوں پر مشتمل ہے جن میں آخری مصرع مشترک ہے۔اس نظم میں مرشد کے استفادہ اور معرفت وسلوک کے صحیح طریقوں کی تلقن کی ہے۔یہ نظم بھی ڈاکٹر حفیظ سید کی ادارت اور شرح کے ساتھ چھپ گئی ہے۔اس کا پہلا اور آخری بند یہ ہے۔

بھودھات یوگی کریں بچار گربُن نہ پاویں سوے
سادھو جن کی سیوانیویں توچہ پر اپت ہووے
گرپر سادھوں کوئی یک جانے دیکھت برلا کوے
لوکا یہ مت کچھ الادھی جن بوجھ بنحتوں لادھی
سکھ کا سرور شاہ میراں جی انت کرن لے مانے
سہسر جبواہوے مکھ میرے نہ پوری کرت بکھانے
آکہیں جانم سوک سہیلا چاکھیا ہوے سو جانے
لوکا یہ مت کچھ الادھی جن بوجھ بختوں لادھی ۸

ان کے علاوہ جانم کی دوسری اردو نظموں کے نام بشارت الذکر، منفعت آلایمان، وصیت الہادی، نکتہ واحد، رموزالواصلین وغیرہ۔ جانم کی تصانیف کا موضوع بھی تصوف ہے۔انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ طرز بیان سادہ ہے۔ فارسی اور عربی کے الفاظ بہت کم استعمال کیا۔۹

اشرف

شاہ اشرف بیابانی نام تھا۔انھوں نے ۱۵۰۳ء میں ایک طویل مثنوی *نوسرہار* لکھی جس میں کربلا کے واقعات کو داستانی انداز میں نظم کیا ہے۔ زبان کی سادگی اور بیان کی بے تکلفی کے اعتبار سے بھی یہ مثنوی اہمیت رکھتی ہے۔ اشرف قندھار شریف کے مشہور بزرگ سید علی سانگڑے سلطان مشکل آسان (متوفی سنہ ۱۴۰۳ء) کے بھانجے اور خلیفہ شاہ ضیاءالدین بیابانی کا جانشین تھا۔ مثنوی *نوسرہار* میں اس نے امام حسین علیہ اسلام کے مصائب نوابواب اور کئی عنوانوں کے تحت بیان کئے ہیں۔ اس

موضوع پر یہ پہلی اردو کتاب ہے اور بہت ہی تفصیل اور ترتیب کے ساتھ منظوم کی گئی ہے۔ اشرؔف نے اپنی زبان کا جگہ جگہ ہندوی لکھا ہے دکنی نہیں۔ ۱۰ اس کی زبان اور طرزِ بیان کا اندازہ ان ابیات سے ہوگا:۔

ناماں کیتا بول سنوار — جانو موتیوں کے راہار
سونے کی جیوں کھونٹی گھڑ — مانک موتی ہیرے جڑ
ایک ایک بول یہ مانک مول — سیم ترازو سنیتھیں تول
بندپروئے سونے تار — سچّیں ہوانو سرہار ۱۱

شوقؔی

شیخ حسن نام، شوقؔی تخلص تھا۔ اس دور میں بیجاپور میں مقیم تھا اور یہیں سے بعد کو گولکنڈہ روانہ ہوا تھا۔ وہ اصل میں ایک جہاں گشت شاعر تھا۔ انکی دو مثنویاں قابل ذکر ہیں۔

۱۔ ظفر نامہ نظام شاہ: انہوں نے مثنوی ظفر نامہ نظام شاہ لکھ کر شہرت حاصل کی۔ یہ ایک لڑائی کا تاریخی بیان ہے جو وجیانگر کے راجا اور نظام شاہ کے مابین ہوئی تھی۔ اس مثنوی سے اس عہد کے واقعات، حالات، زیورات وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

۲۔ میز بانی نامہ سلطان محمد عادل شاہ: بیجاپور میں اس نے عادل شاہ کی شادی کی دعوت کا تفصیلی حال ایک مثنوی میز بانی نامہ سلطان محمد عادل شاہ میں لکھا ہے۔ اس میں اس عہد کے رسم ورواج اور تقریبات وغیرہ کا بیان ہوا ہے۔ یہ مثنوی ۱۶۳۲ء میں لکھی گئی تھی۔ ۱۲

شوقؔی غزلیں بھی اعلیٰ پایہ کی لکھتا تھا اور بلند مرتبہ شاعر تھا۔ اس کی غزلوں کا نمونہ درج ذیل ہے۔

تجھ مکھ کنول کولے بدل جگ میں سرنگ لالہ ہوا
تجھ زلف تھے اپچا بھور دوجا بھونک کالا ہوا ۱۳

محمد قلی قطب شاہ

وہ ایک کامیاب اور محبوب حکمراں ہونے کے علاوہ باکمال شاعر بھی تھے۔ ان کا کلام پہلی مرتبہ ۱۶۱۶ء میں سلطان محمد قطب شاہ نے مرتب کیا اور پھر ۱۹۱۴ء میں ڈاکٹر زوؔر نے ترتیب جدید کے ساتھ شایع کیا۔ محمد قلی قطب شاہ کا طرز بیان سادہ اور سلیس ہے۔ ان کی شاعری میں مقامی عنصر پایا جاتا ہے۔ اس زمانے کے رسم ورواج اور سماجی حالت کا اندازہ ان کی نظموں سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ پہلا شاعر تھے جنھوں نے شاعری کو کارآمد بنانے کی کوشش کی۔ اس کی شاعری پر ہندی شاعری کا اثر ہے اور اسی وجہ سے اس کی غزلوں میں لطافت اور گداز عشق پایا جاتا ہے۔ قطب شاہ کے کلیات میں مثنوی، قصیدہ، ترجیع بند، مرثیہ، غزل سب ہی کچھ ملتا ہے اور اس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو زبان وبیان پر کتنی قدرت حاصل تھی۔ ان کی سرپرستی میں نظم ونثر دونوں کو فروغ ہوا۔ ۱۴

وجہی

وجہی ابراہیم قطب شاہ کے زمانہ میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ اس دور کے مشہور اور کامیاب شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے داستان اردو ادب کی ایک اہم صنف ہے۔ اس کا تعلق کہانی والے ادب (افسانوی ادب) سے ہے۔ داستانیں نظم میں بھی لکھی گئی ہیں اور نثر میں بھی۔ اردو میں سب سے پہلے منظوم داستانیں لکھی گئیں، جو مثنوی کی صورت میں ہیں۔ ان کی شروعات دکنی مثنویوں سے ہوئی۔ اردو کی پہلی مثنوی نظامی بیدری کی کدم راؤ پدم راؤ اصل میں ایک داستانی مثنوی ہے۔ منظوم داستانوں کی طرح نثری داستانوں کی شروعات بھی دکنی زبان میں ہوئی۔ اردو کی پہلی نثری داستان 'سب رس' ہے، جو گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت کے ملک الشعراء وجہی کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔

وجہی کی تصانیف کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کا بڑا عالم و فاضل اور سمجھدار انسان تھا۔ اسلامی علوم، قرآن، حدیث اور تصوف وغیرہ میں اچھی معلومات رکھتا تھا۔ عربی کے علاوہ اسے فارسی زبان پر بھی پوری مہارت حاصل تھی۔ چونکہ فارسی اس کے آباواجداد کی زبان تھی، اس لیے وہ فارسی شعر و ادب کی باریک باتوں اور اہم نکات سے اچھی طرح واقف تھا۔ اپنی شاعری میں اس نے فارسی کے بڑے شعرا جیسے حافظ شیرازی، امیر خسرو، خاقانی، خواجہ حسن سجزی، کمال نجندی وغیرہ کو محبت اور احترام سے یاد کیا ہے۔ عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ وجہی کو دکنی زبان پر بھی مکمل عبور تھا۔ وہ دکنی زبان، گوالیری (برج بھاشا) اور زبانِ ہندوستاں میں فرق کرتا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شمالی ہند کی کچھ بولیوں سے بھی واقف تھا۔ اس کے علم و فضل کی وجہ سے بعد کے زمانے کی تاریخوں میں اسے "ملا" کے عزت والے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ [۱۵]

وجہی نے جب دکنی زبان میں شاعری شروع کی تو اس وقت گولکنڈے میں فیروز محمود اور ملا خیالی جیسے پہلے سے موجود بڑے اساتذۂ سخن مشہور تھے، لیکن وجہی نے شاعری میں شاید کسی استاد کے سامنے شاگردی اختیار نہیں کی۔ وہ شاعری میں کسی کو اپنا استاد نہیں مانتا تھا۔ البتہ اس نے مثنوی قطب مشتری کے شروع کے حصے میں گولکنڈے کے دو اساتذہ خشن فیروز اور محمود کی خوبیوں کو مانا ہے، جو اُس وقت زندہ نہیں تھے۔

وجہی کو اپنے علم، عقل، خیال اور فن پر بہت فخر تھا، جو بعض اوقات غرور تک پہنچ جاتا تھا۔ جس زمانے میں اس کی شاعری پروان چڑھی، اس وقت گولکنڈے میں دکنی زبان میں شاعری کا شوق عام ہو رہا تھا اور کئی اچھے شاعر بھی پیدا ہو چکے تھے، لیکن وجہی کسی کو اہمیت نہیں دیتا تھا بلکہ سب کو اپنے سے کم سمجھتا تھا۔ اس نے اپنی شعری اور نثری کتابوں میں دوسرے شاعروں پر تنقید کی ہے اور کھل کر اپنی تعریف اور بڑائی بیان کی ہے۔ اپنی شاعری کی تعریف کرتے ہوئے وہ فخر سے کہتا ہے۔

نہ نیچے نہ پیچھیا ہے گن گیان میں
سو طوطی منج ایسا ہندوستان میں
کہ باتاں یو سن کر میری گیان کیاں
رھیاں تھک ہو قمریاں خراسان کیاں
جتے شاعراں شاعر ہو آئیں گے
سو منج تے طرز شعر کا پائیں گے ١٦

اگرچہ وجہی نے اپنے زمانے کے زیادہ تر شعرا کو کم تر سمجھا اور ان پر طنز کے تیر چلائے، لیکن کچھ اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خاص نشانہ غواصی تھا، جو اس سے کم عمر ہم عصر تھا۔ مگر سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دور ہی سے وہ ایک شاعر کے طور پر نمایاں ہونے لگا تھا۔ وجہی اس کی شاعری کی طاقت اور بڑھتی ہوئی شہرت سے بے خبر نہیں تھا۔ اسے ڈر تھا کہ غواصی جلد ہی اس کی برابری کا دعویٰ کرے گا۔ اس کا یہ ڈر صحیح ثابت ہوا، کیونکہ محمد قلی قطب شاہ کے بعد غواصی نے آہستہ آہستہ وجہی کی جگہ حاصل کر لی۔ ذیل کے اشعار میں وجہی نے اشارے اور کنایے کے انداز میں غواصی پر تنقید کی ہے۔ ان کی دو کتابیں خاص طور پر مشہور ہیں۔ ١٧

١۔ قطب مشتری: 'قطب مشتری' اردو زبان کی مشہور مثنوی ہے جو ملا وجہی نے ١٦٠٩ء میں تحریر کی۔ مثنوی میں محمد قلی قطب شاہ کی مدح اور اس کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے، اس مثنوی کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس میں وجہی نے "در شرح شعر گوید" کے عنوان سے شعر و ادب سے متعلق اپنے تنقیدی خیالات ظاہر کیے ہیں۔ 'قطب مشتری' کے ہیرو کو شاعر نے محمد قلی قطب شاہ کے نام سے پکارا ہے۔ 'قطب مشتری' کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ممکن ہے اس کہانی کا کوئی تعلق کسی لوک کہانی سے ہو، اژدہا منہ سے آگ اُگلتا ہے، راکھشس جس کے تین سر، چار ہاتھ اور بڑے بڑے دانت ہیں اور جو ہر صبح نو ہاتھیوں کا ناشتہ کرتا ہے۔ ان کی موجودگی لوک کہانیوں کے مافوق الفطری ماحول کی یاد تازہ کرتی ہے۔ اس نسخہ کو ڈاکٹر حمیرا جلیلی نے ترتیب دیا ہے، جس میں بیش قیمت تعارفی مقدمہ کے علاوہ فرہنگ بھی شامل ہے۔ ١٨

٢۔ سب رس: 'سب رس' ایک داستان کی کتاب ہے جسے اردو نثر کی تاریخ میں کافی اہمیت حاصل ہے۔ وجہی نے اسے عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر ١٦٣٥ میں لکھی۔ اردو نثر کی روایت میں اسے اہمیت اس لیے بھی حاصل ہے کیونکہ یہ ادب کے اعتبار سے اردو نثر کی پہلی کتاب ہے۔ اس میں شہزادہ دل اور شہزادی حسن کے عشق کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں اخلاقیات کی تلقین اور انسانی جذبات کی ترجمانی بڑی کامیابی سے کی ہے۔ اس میں ملا وجہی نے جو قصہ، حسن و عشق کی باتیں اور دوسرے معاملات کو پیش کیا ہے اسے بہت خوبصورت، انوکھے اور دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں اسے بہت مقبولیت ملی۔ لوگ اسے بہت دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔ ١٩

'سب رس' کی ایک خصوصیت یہ ہے وجہی نے اس میں صاف، رواں اور انوکھی زبان کا استعمال کیا ہے۔ ان کے لکھنے کے انداز میں روانی اور سلاست ہے۔ لیکن ساتھ ہی کہیں کہیں انہوں نے قدیم اور غیر مستعمل الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے جو قاری کے لیے اجنبی اور غیر مانوس ہوتے ہیں۔ اس میں دکنی الفاظ بھی زیادہ ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے فارسی الفاظ کا استعمال کر کے عبارت کو مسجع و مقفیٰ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح انہوں نے اس داستان میں مقامی محاوروں کا بھی استعمال کیا ہے جو آج کل مستعمل نہیں ہیں۔ اگرچہ اس داستان میں کچھ خامیاں ہیں لیکن تاریخی اعتبار سے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس وقت کی کتاب ہے جب اردو زبان میں ابھی لکھنے کا آغاز ہوا تھا اور اردو کو زیادہ ترقی نہیں ملی تھی۔ ملا وجہی نے اردو نثر میں قدم رکھ کر یہ داستانوی کتاب لکھ کر اردو ادب کے لیے راستہ ہموار کیا۔ ۲۰

عبداللہ قطب شاہ

بادشاہ عبداللہ قطب شاہ کے پچاس سالہ دور حکومت (۱۶۲۶ء۔ ۱۶۷۲ء) میں اردو کو جو ترقی ہوئی وہ بہت کم بادشاہوں کے دور میں ہوئی۔ عبداللہ قطب شاہ خود بھی شاعر تھے اور دکنی زبان میں ان کا کلام موجود ہے۔ زبان نہایت صاف اور سلیس ہے لیکن فکر کی بلندی کم پائی جاتی ہے۔ ۲۱

ولی

ولی اردو شاعری میں ایک طرز خاص کے مالک ہیں۔ انکے کلام میں ایک خاص قسم کی معنویت اور انکی طرز ادا میں عجیب و غریب دل کشی پائی جاتی ہے۔ ولی کو بلاشبہ جنوبی ہند ہی نہیں بلکہ اردو کے عظیم شعراء میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ۲۲

ولی جس عہد میں پیدا ہوئے تھے اس عہد کی زبان زیادہ صاف اور شگفتہ نہیں تھی۔ ولی پہلے شاعر ہیں جن کی زبان اور انداز بیان اس دور کے شاعروں سے مختلف ہے اور اس میں سادگی اور شگفتگی ہے۔ یہی انکی عظمت کا بین ثبوت ہے۔ وہ ایک صوفی صنف انسان تھے۔ آخری عمر میں ان کے کلام میں زیادہ سادگی پیدا ہو گئی تھی۔ جس کے نتیجے میں انکی شاعری زبان و بیان کے اعتبار سے بہت معیاری ہو گئی اور وہ اس مقام تک پہنچ گئے کہ شاہ حاتم اور میر تقی میر جیسے بلند پایہ شعرا نے بھی ان کی عظمت کو تسلیم کیا اور انکی شاعری کی تعریف کی۔ ولی کا دور مادّی ترقی اور بدلتی ہوئی دلچسپیوں کا دور تھا۔ چنانچہ اس میں خارجیت کا رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ محبوب کا سراپا اس کی خصوصیات کے بیان پر حادی ہے۔ ولی چونکہ صاحبِ معرفت تھے۔ اس لئے دل کے سوز و گداز کا اثر ان کے کلام میں بھی جھلکتا ہے گوکہ ان کی باتیں عموماً سیدھی سادی ہوتی ہیں مگر جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں وہاں تخیل کی گہرائی قابل تحسین ہوتی ہے۔ ا۔ معلوم ہوتا ہے ولی نے اس نصیحت کو پلے باندھ لیا گو ابتدائی کلام دکنی غزل کی تمام خصوصیات کا حاصل ہے، لیکن ولی نے فارسی اسلوب اور مضامین کو اپنی دکنی غزل میں یوں سمویا کہ بعد کا کلام آج کی زبان میں معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ زبان کے بارے میں ولی نے جو یہ دعویٰ کیا تو وہ محض شاعرانہ تعلی نہ تھی بلکہ حقیقت تھی:۔

اے ولی صاحب سخن کی زبان
بزمِ معنی کی شمع روشن ہے ۲۳

فیروز

فیروز بھی مشتاق اور لطفی کی طرح بیدر کا شاعر تھا اور وہیں کے ایک مشہور صوفی اور صاف تصانیف عالم مخدوم جی شیخ محمد ابراہیم (متوفی سنہ ۱۵٦۴ء) کا معتقد اور مرید تھا۔ مخدوم جی اپنے والد شیخ محمد ملتانی کے خلیفہ اور جانشین تھے۔ مخدوم جی اپنے عہد کے بڑے مقبول اور مشہور بزرگ تھے۔ ان کی شہرت گولکنڈہ میں بھی پہنچ گئی تھی اور ابراہم تطب شاہ نے ان سے ملاقات کی درخواست کی جس پر انھوں نے انکار کر دیا۔ ابراہم نے کہلا بھیجا کہ مخدوم جی تشریف نہ لاتے ہوں تو نعلین ہی بھیج دیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مخدوم جی نے نعلین کی جگہ اپنے مرید شاعر فیروز کو گولکنڈہ بھیج دیا اور چونکہ وہ بیدر کی فضائے شعر و سخن میں رنگا ہوا تھا اس لئے گولکنڈہ میں بھی بہت چمکا اور وہاں کے نوجوان شعراء نے اس سے بہت فیض حاصل کیا۔ ۲۴ چنانچہ وجہی اور ابن نشاطی نے اس کو اپنا استاد لکھا ہے۔ چنانچہ اس کی وفات کے بعد ابن نشاطی کہتا ہے۔

نہیں وہ کیا کروں فیروز استاد جو دیتے شاعری کا کچھ مرے داد ۲۵

فیروز کی ایک مثنوی 'توصیف نامہ میران محیالدین' موجود ہے جس میں حضرت عبدالقادر جیلانی اور مخدوم جی شیخ محمد ابراہم کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اعلیٰ پایہ کا شاعر تھا۔ ۱۳ نمونہ کلام یہ ہے۔

ابراہم مخدوم جی جیونا

مئے صرف وحدت صدا پیونا

میرا پیر مخدوم جی جگ منے

منگوں نعمتاں میں سدا اس کئے

کریں منجھ اپر پیار اے پیو جگ

کہ تجھ پیار تھے ہوے مندھیر جگ ۲٦

عبدل

عبدل ابراہیم عادل شاہ ثانی کا درباری شاعر تھے۔ انہوں نے بادشاہ کی ہدایتوں کے مطابق "ابراہیم نامہ" لکھا جس میں سات سو سے زاید اشعار ہیں۔ اس طویل نظم کا زمانہ تصنیف ۱٦۱۲ء کو متعین کیا گیا ہے۔ ۲۷

نصرتی

محمد نصرت نام، نصرتی تخلص تھا۔ انہوں نے علی عادل شاہ کے عہد میں ملک الشعراء کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ اس کے حالاتِ زندگی اور کلام پر مولوی عبدالحق صاحب نے ایک بسوط کتاب مرتب کر کے چھپوائی ہے اور اس کی مثنویاں *گلشن عشق* اور *علی نامہ* بھی شایع ہو چکی ہیں۔ وہ رزمیہ اور بزمیہ دونوں قسم کی شاعری کا استاد تھا۔ غزلیں بھی لکھی ہیں اور قصیدے بھی۔ خاص کر

قصیدہ نگاری میں دکن کا کوئی شاعر اس کا ہم پّلہ نظر نہیں آتا۔ نصرتی بیجاپور کا ایک موروثی سلحدار تھااور کئی پشتوں سے حضرت خواجہ بندہ نواز کے سلسلہ میں مرید۔ان باتوں پر اس نے اپنی کتابوں میں بڑا فخر کیا ہے۔ وہ علی عادل شاہ کا بچپن کا ساتھی اور مقرب تھااور اس زمانے کے رواز کے مطابق خود کو بادشاہ کا شاگرد ظاہر کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بادشاہ کے استاد بھی خود کو شاگرداور بادشاہ کو اپنا استاد لکھا کرتے تھے۔

نصرتی کو بیجاپوری دربار میں وہ عزّت اور مرتبہ حاصل تھا جو کسی اور دکنی شاعر کو کسی اور جگہ حاصل نہیں ہوا۔ وہ ہر وقت علی عادل شاہ کے ساتھ رہتااور رزم و بزم دونوں میں اس کا شریک تھا۔اس نے علی عادل شاہ کے صرف دوسال بعد ہی سنہ ۱۶۷۵ء میں وفات پائی۔اس نے سنہ ۱۶۵۷ء میں ایک رزمیہ مثنوی گلشن عشق لکھی جس میں کنور منوہر اور مدملتی کی عشقیہ داستان قلم بند کی ہے اور دراصل اسی کتاب سے اس کی استادی اور صاحب کمالکا اندازہ ہوتا ہے۔اس کی غزلوں کے ایک مجموعہ 'گلدستّہ عشق' کا بھی ذکر ملتا ہے۔اس کی چوتھی کتاب 'تاریخ اسکندری' علی عادل شاہ کی وفات کے بعد مرتب ہوئی تھی اور علی کے جانشین سکندر عادل شاہ سے منسوب ہیں۔ نصرتی کی تین تصانیف مشہور ہیں۔۲۸

ا۔ گلشن عشق: قدیم دکنی شاعر نصرتیؔ اپنی مثنوی گلشن عشق جو پیشتر لکھی گئی مثنوی سے ماخوذ تھی لیکن وہ اپنے تجربات اور تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعہ اس مثنوی کو برتر اور اعلی مقام دلوایا، اور اس قصہ میں ان روایات کو بڑی فنکاری سے سمودیا جو اس وقت رائج تھے۔اس مثنوی میں بھی دوسری قدیم مثنوی کی طرز پر مختلف مہمات اور کسی قیمتی چیز کی تلاش بسیار میں مصیبتوں اور آزمائشوں سے نبرد آزما ہونے کے عمل کو بیان کیا گیا ہے۔اس کہانی کے واقعات میں انسانی خواہشات، سماجی اقدار، ہمدردی، حسد اور قدیم طرز زندگی کے رموز کو پیش کیا گیا ہے۔ نصرتیؔ اس مثنوی میں حمدیہ اشعار، مناجات، نعت، حضرت بندہ نواز کی تعریف، بادشاہ کی مداح (علی عادل شاہ)، عقل کی تعریف، عشق کی مدح، فقیر کا بیان، باغ کا سماں، صبح، چاندنی کی کیفیت، فراق کی کیفیت، کشتی کی روانی، سردی کا بیان اور باغ کی سیر کی منظر کشی میں وسعت معلومات اور زبان پر قدرت کا عملی ثبوت پیش کیا ہے۔لکھتے ہیں۔

درونے کاات فکر سوں کھود کھن
نکالیا ہوں کئی رنگ برنگی رتن
جسے گل ہے نزاکت کانول اس بن میں
یک رنگ پیالا رہے اپس فن میں
ہو طبع معطر دے رنگین نظر
جن سیر کرے عشق کے اس گلشن میں۲۹

یہ مثنوی نصرتیؔ کے شاعرانہ تخیل کی وضاحت کرنے کے علاوہ ان کے ہاں ٹھیٹ دکنی زبان کا استعمال ہے اور اس زبان میں ایک نئے رنگ و آہنگ کے موجد رہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں ان موضوعات کو برتا جو ان سے قبل ناپید تھیں دکھنی نصرتیؔ سے قبل ایک بے مایہ زبان سمجھی جاتی تھی انہوں نے اس زبان میں ایک نئی روح اور ایک نئی شان پیدا کی ہے۔

۲۔ علی نامہ: اس میں اپنے بادشاہ کے معرکوں وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور ضمناً گئی قصیدے بھی لکھے ہیں۔

۳۔ تاریخ اسکندری: یہ مثنوی سکندر عادل شاہ کے زمانے پر مشتمل ہے۔ ۳۰

باجنؔ

شیخ بہارالدین باجنؔ گجرات کے قدیم ترین صوفی شعراء میں سے ایک ہیں۔ ان کی سب سے اہم تصنیف ''خزائن رحمت'' ہے۔ اس میں دوہے اور متفرق اشعار ملتے ہیں۔ وہ اپنی زبان کو ہندوی اور گجراتی کہتے ہیں۔ انھوں نے ایک مختصر مثنوی "جنگ نامہ ساڑی وپیشواز" بھی لکھی ہے۔ ۳۱

محمد اکبر حسینی

یہ خواجہ بندہ نواز کے صاحب زادے ہیں۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی کے زبردست عالم تھے۔ باپ کے ساتھ دکن آئے اور باپ کے خلیفہ بھی تھے۔ آپ کو نظم اور نثر دونوں میں کمالیت حاصل تھی۔ انکی نظم کا نمونہ یہ ہے۔

بیٹے کوں باپ بولے بیٹا کہے پدر تیں
ہونا مرید جلدی لیکر بجا امر تیں ۳۲

بہر حال اس طرح ان تمام مذکورہ دکنی شعرا نے اردو زبان کو اختیار کرتے ہوئے اردو میں اپنے خیالات کو منظوم شکل عطا کی۔ اس سے ایک تو اردو زبان کوس فروغ ملا اور دوسرا اس سے اردو شاعری کے متعدد اصناف کا آغاز اور ارتقا ہوا اور اردو شاعری کو فروغ حاصل کرنے کا موقع فراہم ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی کائنات میں دکن ہر اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ چاہے ہم اسے لسانی اعتبار سے دیکھیں یا ادبی حیثیت سے۔ دونوں اعتبار سے دکنی خدمات قابل ذکر ہیں۔

منابع ومآخذ

۱۔ نصیرالدین ہاشمی، دکن میں اردو، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص: ۴۱-۴۰

۲۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ، دکنی ادب کی تاریخ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۹ء، ص: ۲۰-۲۲

۳۔ ایضاً، ص: ۲۱

۴۔ ایضاً، ص: ۲۱

۵۔ ایضاً، ص: ۲۲

۶۔ ایضاً، ص:۲۲

۷۔ ایضاً، ص:۳۰

۸۔ ایضاً، ص:۳۱

۹۔ رام بابو سکسینہ، *تاریخ ادب اردو*، کمار پریس، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء، ص:۷۶-۷۷

۱۰۔ نسیم انوار ہاشمی، *میزان تنقید*، کراچی بک سنٹر، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص:۹-۱۰

۱۱۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ، *دکنی ادب کی تاریخ*، ۱۹۸۹ء، ص:۲۰

۱۲۔ فخر دین نظامی، *مثنوی کدم راؤ پدم راؤ*، ایجو کیشنل ہاوس، دہلی، ۱۹۷۳ء، ص:۷ ۴-۴۴

۱۳۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ، *دکنی ادب کی تاریخ*، ۱۹۸۹ء، ص:۳۷

۱۴۔ عظیم الحق جنیدی، *اردو ادب کی تاریخ*، ایجو کیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۰ء، ص:۶۲

۱۵۔ پروفیسر اویس احمد ادیب، *اردو کا پہلا شاعر پہلا مدون ولی دکھنی*، اسرار کریمی پریس، ۱۹۴۰ء، ص:۹-۱۰

۱۶۔ ایضاً، ص:۱۲

۱۷۔ ایضاً، ص:۱۴

۱۸۔ ڈاکٹر سید ظہیر الدّین مدنؔی، *اردو غزل ولیؔ تک*، اسماعیل یوسف کالج، بمبئ، ۱۹۶۱ء، ص:۶۰-۶۱

۱۹۔ ملا وجہی، *سب رس*، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، دکن، ۱۹۳۲ء، ص:۶۰-۶۱

۲۰۔ ایضاً، ص:۲۴

۲۱۔ ملا وجہی، *قطب مشتری*، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئ دہلی، ۱۹۳۹ء، ص:۶۰-۶۱

۲۲۔ ملا نصرتی، *گلشن عشق*، انجمب ترقی اردو، پاکستان، کراچی، ۱۹۵۲ء، ص:۶۰-۶۱

۲۳۔ نور الحسن ہاشمی، *کلیات ولی*، گیتا آفسٹ پرنٹرس، نئ دہلی، ۲۰۰۸ء، ص:۴۹-۵۰

۲۴۔ ایضاً، ص:۴۴-۵۰

۲۵۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ، *دکنی ادب کی تاریخ*، ۱۹۸۹ء، ص:۱۸

۲۶۔ ڈاکٹر سید ظہیر الدّین مدنؔی، *اردو غزل ولیؔ تک*، ۱۹۶۱ء، ص:۱۸

۲۷۔ ایضاً، ص:۴۷

۲۸۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ، *دکنی ادب کی تاریخ*، ۱۹۸۹ء، ص:۴۴

۲۹۔ ایضاً، ص:۴۵

۳۰۔ ڈاکٹر سید ظہیر الدّین مدنؔی، *اردو غزل ولیؔ تک*، ۱۹۶۱ء، ص: ۴۸

۳۱۔ ایضاً، ص:۴۹

۳۲۔ ایضاً، ص:۲ ۵